

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

قارئین ترجمان القرآن تک یہ مبارک اطلاع پہنچ چکی ہوگی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب جو پاکستان میں نظام اسلامی کے قیام کی کوشش کرنے کے جرم میں کسی عدالتی تحقیقات کے بغیر نظر بند کیے گئے تھے، بیس ماہ کے بعد حکومت کی طرف سے رہا کر دیئے گئے ہیں۔ رہائی کی فوری وجہ تو لاہور ہائی کورٹ کا یہ رد ٹانگ تھا کہ سیفٹی ایجٹ کے تحت کسی شخص کو مسلسل اٹھارہ ماہ سے نام نہان نظر بند نہیں رکھا جاسکتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریلے عام کا دباؤ بھی اپنا کام کر رہا تھا اور حکومت گذشتہ دو تین ماہ سے ان حضرات کی رہائی کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن ہم ان سارے وجوہ سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ حیب اللہ کے نزدیک ان حضرات کا جیل جانا تحریک اسلامی کی ترقی کے لئے ضروری قرار پایا تو یہ نظر بند کر دیئے گئے اور جب تحریک ہی کا قیضاً ہوا کہ انہیں باہر آنا چاہیے تو جیل کے پھانک زخود کھل گئے۔ بہر حال ساری ملت کے لئے یہ ایک مبارک موقع آیا ہے اور ہم اس کے لئے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

ترجمان کی ادارت ایک ایسی ذمہ داری تھی جسے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی غیر حاضری میں طوفاناً کرہاً سرانجام دینا پڑا ہے، ورنہ راقم انہی صلاحتوں کے لحاظ سے اس کا اہل کبھی نہ تھا اور یہ بوجھ میرے لئے ہمیشہ موجب تشویش رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ترجمان القرآن کی ادارت

اہل با مقول میں منتقل ہو اور قارئین کی طرح راقم الحروف بھی اس سے ذہنی دروہانی روشنی حاصل کرے۔

نعیم صدیقی

ابن سطور میں ہم اس طبقے کی ان تمام ذہنی گروہوں کو کھول دینا چاہتے ہیں جو دین و سیاست کی تفریق کے غیر اسلامی نظریے نے ڈال رکھی ہیں۔

چھٹی صدی ہجری تک دین و سیاست کے درمیان جو آویزش بپا رہی تھی، اس نے ایک فیصلہ کن انجام پر پہنچنے کے بعد دین کو زندگی سے الگ ہٹا کر جامد مذہبیت کے سانچے میں ڈھلنے پر مجبور کر دیا۔ اس دور کے بعد سے لے کر اب تک جامد مذہبیت مسلسل ارتقاء کرتی رہی ہے اور بعض اکابر صلحائے امت نے جو اصلاحی و انقلابی کوششیں سرانجام دیں وہ حالات کا رخ بدلنے میں ناکام رہ گئیں۔

جامد مذہبیت کے فردغ پانے کے بعد مسلمان کے ذہن سے یہ بات تو بالکل نکل ہی گئی کہ اسلام کی دعوت میں کوئی انقلابی پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ اور اس کا طریق کار ایک بڑھنے اور پھیلنے والی تحریک کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہئے۔ یہ شعور بالکل ختم ہو گیا کہ اسلام نظام سیاست و تمدن کو اپنے نقشے پر ڈھالنا چاہتا ہے اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے وہ قیادت و اقتدار کی باگ ڈور پر بلا شرکتِ غیر سے مکمل قبضہ چاہتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کے سرپرستوں نے اسلام کو نظام کفر کے ساتھ میں ایک پر امن اور وفادار خادم کے مقام پر گرانے کی کوشش کی اور اسے ہر قسم کے ماحول میں "بے مزہ" و صرم بنا کر رکھنے کے لئے اپنی قوتیں صرف کر دیں۔

اس طرح جب "تحریکیت" کے بجائے اسلام میں جامد مذہبیت کے انداز پیدا کر دیئے گئے تو پھر دین کی دعوت، دینی نظم جماعت، دینی تحریک، دینی مقاصد، دینی طریق کار وغیرہ کے مفہوم میں بھی جمود سرایت کر گیا اور دینداری اور جمود باہم لازم و ملزوم ہو گئے۔ جن حضرات نے ایک طویل مسنت کے بعد یہ صورتِ حالات پیدا کی ہے ان کے سامنے اسلام کا ایک ایسی تحریک بن کے ابھرنا جو قوت کی باگ ڈور سنبھال کر زندگی کی ساری کارگاہ کو نئے انداز سے منظم کرنا چاہتی ہے، ایک ایسی انوکھی صورتِ حالات ہے جس سے

خواہ مخواہ اُپداتے ہیں اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حرکت و عمل کا یہ سارا طوفان ایک مہنگا مٹہ دینویت ہے اس میں دین کی اصل روح کا فرما ہوا ہی نہیں سکتی۔ وہ اس نشوونما پاتی ہوئی تحریک پر جب نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنی آنکھوں پر انہیں چند خاص اصطلاحات کی رنگین مینکیں لگا کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں جو جامد ذہنیت کے تنگ تصورات کی حامل ہیں۔ ان تنگ تصورات کے تنگ پیمانوں سے جب وہ جماعت اسلامی کی مرکز پروردگار کو اپنا چاہتے ہیں تو یہ پیمانے چھٹک جلتے ہیں اور وہ ذہانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ:-

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوے اور اپنی دواں، ہر دم جہاں ہے زندگی پس اُن کے لئے یہ تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اُن کے مخصوص دینی پیمانوں سے جس دینداری کو نہیں ناپا جاسکتا وہ بھی مستند دینداری ہو سکتی ہے، بلکہ ان کے نزدیک جو کچھ جامد ذہنیت کے پیمانوں سے چھٹک کے باہر گرجائے اسے لازماً دینویت ہونا چاہئے۔

اس طرح کے محدود مذہبی تصورات کو ذہنوں میں جگہ دے کر یہ سمجھنا آدمی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ ایک نشوونما پاتی ہوئی تحریک کس طرح چلا کرتی ہے، اسے ہر ہر قدم پر کس طرح فوبہ ذمراہ میں پیش آتے ہیں اور وہ انہیں کن کن طریقوں سے حل کرتی ہوئی آگے بڑھا کرتی ہے۔ اگر جامد ذہنیت کی بنیادی گرہ کھل جائے تو پھر باقی ساری گرہیں خود بخود کھل سکتی ہیں۔ اسلام کے تحریکی مزاج کو اگر سمجھ لیا جائے تو پھر اس حقیقت کا فہم کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ دین کی علمبرواری کرنے والے کسی کارواں کا راستہ کن کن واہلوں سے ہوتا ہوا اور کن کون سے موڑ مڑتا ہوا آخری نصب العین تک پہنچتا ہے۔ لہذا اب ضروری ہے کہ ہمارے دینی حلقوں کے حضرات اسلام کی ماہ و عمل اور اس کے مراحل کار کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تحریکی فطرت کو پیش نظر رکھیں۔



جامد ذہنیت نے دعوتِ دین کی اصطلاح کو مروجہ تبلیغ کا محدود مفہوم دے کر جس سطح پر گرا دیا ہے وہ اسلام کے تصورِ دعوت و تبلیغ سے بہت ہی پست ہے۔ بخلاف اس کے جماعت اسلامی "دعوت" کی اصطلاح کو اس کے جامع مفہوم کے ساتھ اپنے پیش نظر رکھتی ہے۔ ہمارے سامنے صرف چند ماہ بعد

الطبیعی عقاید اور فقہی جزئیات پر وعظ کہنے اور انفرادی گفتگو میں کر لینے کا پروگرام نہیں ہے، بلکہ ہماری
دعا - اہمیت دین کی دعوت ہے۔ ہم ایک غلط نظام زندگی کو اسلامی نظام زندگی میں برسنے کے داعی
ہیں۔ ہماری دعوت کا خطاب صرف افراد ہی سے نہیں، بلکہ معاشرے کے مجموعی وجود اور تمدن و سیاست
کے ہمہ گیر ادارہ بھی ہے۔ اس طرح کی وسیع عملی دعوت کے تقاضے صرف وعظ گوئی سے پورے نہیں ہو سکتے
بلکہ یہ دعوت اذان سے رجز تک کے سارے مراحل کو محیط ہے۔ یہ دعوت صرف لفظوں ہی سے نہیں دی
جاسکتی بلکہ اس کی صداقت کی گواہی عمل و کردار کے مظاہرے سے دینی ناگزیر ہوتی ہے پھر یہ دعوت تشریح
افراد کے ذریعے اپنے مقاصد کو نہیں پہنچ سکتی، بلکہ یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے تنظیم جماعت کی متقاضی
ہے۔ کبھی یہ دعوت نامسمانہ پیرائے میں دینی پڑتی ہے، اور کسی موقع پر ناقدانہ پیرائے میں، کبھی اس کے لئے
نرم سے نرم انداز ڈھونڈ کے لانا پڑتا ہے اور کبھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ گرم سے گرم پیرائے بیان اختیار کیا
جائے۔ یہ دعوت ایک طرف تعاون علی التبر کے لئے الفت و شفقت سے اپیل کرتی ہے اور دوسری
طرف یہی و غلغ و نترک من یغیرک کا مظاہرہ کرنے کے لئے غفلت و شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی
ہے پھر یہ پہلے قدم پر جو کچھ ہوتی ہے، دوسرے قدم پر اس سے زیادہ وسعت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر تیسرے
قدم پر کسی نئے انداز میں اور زیادہ زور دار ہمہ گیری کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ پورے معاشرہ
پر چھا جائے۔ یہ دعوت لڑاتی بھی ہے۔ اور صلح بھی کراتی ہے، یہ لڑتی بھی ہے اور جوتی بھی ہے، اور مختلف
احوال و مشنوں سے گذرتی ہوئی اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے۔

اجتماعی انقلاب کی دعوت دینے والی کوئی بھی جماعت ہو۔ اسلامی یا غیر اسلامی۔ حقیقت

اس کا وجود ہمہ تن دعوت ہوتا ہے۔ وہ اس وقت بھی دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنا ابتدائی تعارف کرا رہی
ہو، اس وقت بھی دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی مخالف طاقتوں پر تنقید کر رہی ہو، اور اس وقت بھی
دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ برسرِ اقتدار طاقتوں کے خلاف پارچہ شیدائے کے میدان میں آئے۔ کسی جماعت
کا ایک اصول کے ساتھ موجود ہونا، اس اصول کی کسوٹی پر پیش نظر حالات کو پرکھنا، اس کے مطابق مختلف مسائل
میں رائے دینا، اس اصول کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر نظام زندگی کی تبدیلی کا کوئی پروگرام پیش کرنا، اس

اصول کا حق ادا کرنے والی قیادت کو برسر عمل لانے کی کوشش کرنا، یہ سب کچھ مہم تن اس اصول کی طرف دعوت دینے کا ایک وسیع الاثر نظام کا رہے۔

بالکل اسی طرح جماعت اسلامی کا ایک اصول کی علمبردار جماعت کی حیثیت سے موجود ہونا، اور مختلف سرگرمیوں میں اس اصول کا مظاہرہ کرنا تمام تر دعوتِ دین ہے۔ اس کا لٹریچر، اس کے پوسٹر، اس کے جلسے، اس کے ریزولوشن، اس کے بیانات، اس کی تنقیدیں، اس کے احتجاج، اس کے مظاہرات، اس کی پالیسی، اس کی مجلس شوریٰ کے فیصلے، اس کے ہفتہ وار، ماہانہ، سہ ماہی اور سالانہ اجتماعات، اس کی سوشل خدمات، اس کے کارکنوں کے ادبی حلقے، وغیرہ از سر تا پا اپنی مجموعی حیثیت سے اقامتِ دین کی دعوت ہیں۔ ایک اجتماعی انقلاب کی علمبردار جماعت کی سرگرمیوں کا مجموعہ دعوت ہوتا ہے، نہ یہ کہ دعوت اس کی سرگرمیوں کا ایک جز ہو۔

جن اصحاب پر دعوت کا یہ تصور اپنی پوری دستوں کے ساتھ واضح نہیں ہے، ان کو جماعت اسلامی کی بہت سی گرمیاں دعوت کے ماوراء، بلکہ دعوت سے متضاد معلوم ہوتی ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دعوتِ دین کو پس پشت ڈال کر یا اسے ایک گونہ کمزور کر کے کچھ دوسرے سیاسی کام کئے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے حضرات جماعت اسلامی کی دعوت کے کسی نئے مرحلے میں داخل ہونے پر بہت اُپر اتے ہیں کہ یہ کیا ہونے لگا۔ چنانچہ جب جماعت اسلامی نے مطالبہ نظام اسلامی کی ابتدائی تحریک لے کے آگے چلی تو بھی ان کو کوٹنگ ہوئی، پھر جب انقلابِ قیادت کی صدا بلند کی گئی تو اس وقت بھی ان کو الجھن ہوئی، پھر جب شرکتِ انتخابات کا فیصلہ کیا گیا تو بھی ان کو شکایت ہوئی کہ جماعت دین سے سیاست کی طرف دھچک گئی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اب جب احتجاجِ مظاہرے کا نیا مرحلہ سامنے آیا تو اس پر ان حضرات کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ کجا دعوتِ دین اور کجا احتجاجی مظاہرے؟ حالانکہ یہ سب کچھ عین جائز اور حق ہے اور یہ سب کچھ دعوتِ دین سے الگ نہیں۔

یہ دعوتِ دین کا تصور جب تک درست ہو کر اپنی پوری دستوں کے ساتھ ذہنوں میں جاگزیں نہ ہوگا ہمارے بہت سے معترضین اور خیر خواہ جماعت اسلامی کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے پر قادر نہ ہو سکیں گے۔

خدا جانے کہاں سے یہ عجیب و غریب تخیل بھی دلوں میں آگسا ہے کہ جو دین کی دعوت دے۔ وہ بس دعوت ہی دے، کچھ اور نہ کرے۔ ایک داعی جماعت کے لئے یہ جائز نہیں سمجھا جاتا کہ وہ اقتدار پر تنقید کرے یا اس سے کسی اجتماعی حق کا مطالبہ کرے، یا اس کے مظالم کے خلاف احتجاج کرے۔ اس نظریے کے لئے خود اس کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ بھی ایک نتیجہ ہے جادو سمیت سے متاثر چلے آنے کا

جہاں تک تنقید — اور بالخصوص وقت کی قیادت پر تنقید کا تعلق ہے، یہ ہمیشہ دعوتِ اقامتِ دین کا ایک جزو رہی ہے، اور اب اس اثر و اقتدار پر پبک کے سامنے چارج شیٹ مرتب کر کے لانے کا کام تاریخِ دین میں کوئی انوکھا کام نہیں ہے، بلکہ خود انبیاءِ علیہم السلام ہی نے اس ناخوشگوار ذبیحے کو ادا کر کے ہمارے لئے مثالیں قائم فرمادی ہیں۔ اس معاملے میں بہترین نظیر آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ان تنقیدوں میں ملے گی جو دعوتِ الی اللہ کے ساتھ ساتھ آپ نے وقت کے اجبار و ہرجاں پر کی تھیں جن کے اکتھوں میں رائے عام کی باگ ڈور تھی۔ پھر آپ کو اس کا واضح اور جامع نمونہ نبیِ مسلم کی دعوت میں ملے گا کہ آپ کی زبان سے ہر الجہانی خطبے نشر ہوئے تھے ان میں قریش مکہ کی معاشرتی لیڈر شپ، متولیانِ کعبہ کی مذہبی قیادت، شعراء و خطبائے قریش کی فکری و ادبی پیشوائی، سود خوارانِ مکہ کی معاشی سربراہ کاری، کاہنوں اور نجومیوں کے عالمِ تصوف کی عنان برداری اور اہل کتاب کی فتنہ آمیزت پر انتہائی گڑھی تنقیدیں موجود ہیں، بلکہ قرآن کی بعض سورتیں ان مقتدر عناصر کے خلاف لکھے کھیلے چارج شیٹ سے گزرنے والی ہیں۔ اسی تنقید نے مخالفین تحریکِ اسلامی کے اخلاقی موقف کو کھوکھلا کیا، تب کہیں جا کر تبدیلی کے لئے راستے ہموار ہوئے۔

علاوہ بریں آپ اگر اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صلحاء نے امت نے خلفاء و سلاطین پر بہت ہی بے لاگہ تنقیدیں کی ہیں اور پھر اپنے جرمِ صاف گئی کی خوفناک سزائیں برداشت کی ہیں، لیکن وہ کبھی اس پر راضی نہیں ہوئے کہ محض توحید و رسالت کے عقائد کی تلقین کرنے پر اکتفا کریں اور پھر یہ سمجھ بیٹھیں کہ دعوتِ دین کا حق ادا ہو گیا۔ ورنہ جانیے، یہیں اپنے ملک کے اندر شاہ ولی اللہ دہلوی

کے علمی کارنامہ دعوت کا جائزہ لیجئے اس میں آپ کو حکمرانوں اور عوام کے تمام طبقات کے متعلق انتہائی تبلیغ تنقیدیں ملیں گی اور یہی ملل شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ کی تحریروں کا ہے۔

میں اسی طرح خود مطالبہ بھی تحریک اسلامی کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک طرف فرعون کے دربار میں خالص توحید کی دعوت لے کے جاتے ہیں، لیکن دوسری طرف وہی حضرت موسیٰ ہیں کہ ارسل معی بنی اسرائیل کا مطالبہ لے کر ہوتے مصروف تقاضا نظر آتے ہیں، اور اس مطالبے کو منوا کے چھوڑتے ہیں۔ یا کوئی شخص گمان بھی کر سکتا ہے کہ خدا کے نبی نے دعوت دین کو پس پشت ڈال کر ایک سیاسی مطالبے کو اپنا مقصود بنا لیا تھا؟ نہیں یہ مطالبہ خود دعوت دین ہی کے تغذات میں شامل تھا۔ بالکل اسی طرح دعوت کو لے کر چلتے ہوئے احتجاج اور مظاہرے کی منازل بھی آسکتی ہیں، یہاں تک کہ خدا کے انبیاء کو دعوت دیتے دیتے دنیا نے اس حال میں بھی دیکھا کہ تلواریں لئے عرشہ پیکار میں وہ فریضہ انجام دے رہے ہیں جو دعوت اسلامی کے پاکیزہ نصب العین کے تحت لازم نہ ہو جائے تو دنیا کا مکروہ ترین فعل ہوتا ہے۔

پس دعوت کے غلط تصور اور تبلیغ کے غلط ذوق کی بینک سے اگر جائزہ لیا جائے تو پھر نتیجہ یہی ہوگا کہ وعظ و تلقین کے علاوہ جو کچھ بھی ایک تحریک سے صادر ہو وہ اس کی دامیانہ حیثیت کے منافی قرار پائے درحقیقت، یہ بات پتے باندھ بیٹھنے کی ہے کہ دعوت دین کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے نظام کو برپا کرنے کے لئے جتنے بوزیم و درکار ہوں ان کو فراہم کیا جائے اور جتنی رکاوٹیں حاصل ہوں ان کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ ان دونوں مقاصد کے لئے جائز حدود میں جو جو کچھ بھی اقدام کئے جائیں گے وہ سب دعوت دین کی تعریف میں داخل ہوں گے۔ ان میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اقدام دعوت کو پس پشت ڈالنے والا ہے۔

یہ سب صحیح تصور دعوت، اور اس تصور دعوت کے ساتھ کام کرنے والی جماعتوں اور تحریکوں کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

کچھ حضرات کو خاص طور پر احتجاج "تحریک اقامت دین کے مزاج سے ناسازگار محسوس ہوتا ہے یہی وجہ وہ اس بات کو لازم سمجھتے ہیں کہ ظلم کو بہر حال چپ چاپ سہنا چاہئے اور اس کے خلاف رائے عام کو تیار کرنے یا اقتدار کو اس سے باز رکھنے کے لئے کسی طرح کی جنبش نہیں کرنا چاہئے۔ یہاں بھی دعوئے بلا دلیل ہے۔

اول تو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلامی نظام کے سوا ہر نظام زندگی ایک مجسم و منتظم ظلم ہوتا ہے اور اس ظلم کے خلاف تحریک اسلامی کا عین وجود ہی یکسر احتجاج ہوتا ہے۔ دوسری حقیقت یہ بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ظلم کرنے والے کو ظلم کرنے کے لئے کھلی چھٹی دیئے رکھنا دین کے مشاک کے بائیں خلاف ہے۔ ظلم کا اگر ماتہ پکڑا جاسکتا ہو تو باجہ پکڑنا چاہئے اور اگر زبان ہی سے اسے ٹوکنا ممکن ہو تو زبان سے ٹوک دینا چاہئے اور اگر اس کی بھہہت نہ ہو تو جب تک یہ حالت قائم رہے دل سے ظلم کے خلاف نفرت کرنا لازم ہے۔ اور حدیث نبوی کی رو سے اسے ظالم بھائی کی خیر خواہی اور مدد کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے ظالم کو ظلم کی اجازت دے دینا اور کسی قسم کے احتجاج کی طاقت رکھتے ہوئے آواز نہ اٹھانا ظلم کے فروغ میں مدد دینے کے برابر ہے۔ خود قرآن نے بدیں الفاظ ہر انسان کو حق احتجاج دیا ہے کہ:-

لا یحِبُّ اللّٰهُ الْجَبْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ اللّٰهُ کَیْ ذِیْ بَیِّنَاتٍ لِّیَکْفُرَ بِمَنْ یُّکْفِرْ
 الا من ظلم۔ بجز اس کے جو مظلوم ہو۔

یعنی اسلام نے مظلوم فرد، مظلوم جماعت، مظلوم معاشرے اور مظلوم قوم کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے اور ظلم کرنے والی طاقتوں کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرے۔ اس میں کسی طرح کی شرعی رکاوٹ نہیں ہے فی نفسہ احتجاج بالقول کا حق خدا کے انبیاء نے بھی استعمال کیا ہے چاہے اُس کا پیرایہ کچھ ہی رہا ہو۔ مثلاً:-

حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے جب آنا دی کے بند دروازے کھولے جانے کا فیصلہ ہوتا ہے تو وہ اُس ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جو ان پر روا رکھا گیا تھا، چنانچہ وہ پورے معاملے کی تحقیقات کا مطالبہ کرتے ہیں اور فرعون کے سامنے یہ سوال رکھتے ہیں کہ فما بال الذنوب التي قطعن ایدینکم۔ چنانچہ آپ کی بے گناہی نکھر کے سامنے آ جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے احسان جتانے پر یہ احتجاجی فقرہ ارشاد فرماتے ہیں:-

تلك نعمة تمنها على ان عبدت بنی تیری کرم فرمائی جس کا مجھ پر تو احسان دھرتا ہے یہی تو اسرائیل - ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلامی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم جب بے حیائی پر تل جاتی ہے تو آپ اسے مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-
الیس منکم رجل رشید؟ کیا تم میں کوئی ایک سنجیدہ آدمی بھی باقی نہیں رہا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب وقت کے اقتدار پرست مقصدین کا ایک غول گرفتار کرنے آتا ہے تو وہ اسکے طریقہ عمل کے خلاف اظہار احتجاج کے لئے یہ فرماتے ہیں کہ جب میں مہیکل میں بیٹھ کر تعلیم دیا کرتا تھا تو اس وقت تو تم نے مجھے نہ پکڑا، لیکن آج تم لاشیاں اور کلبھاریاں لے کر چروں اور ڈاکوؤں کی طرح مجھے گرفتار کر گئے ہو پھر ایرانی دربار میں جب نبی صلعم کے قاعدوں سے مساواتِ انسانی کے خلاف سلوک کیا گیا تو انہوں نے وہیں بھرے دربار میں اس طریقہ عمل کے خلاف اپنے جذباتِ حقارت کا پوری بے باکی سے اظہار کر کے اتمامِ حجت کر دیا۔ پس احتجاج کو تحریکِ اسلامی سے فی نفسہ کوئی منافات نہیں ہے۔ ایک اسلامی تحریک کا احتجاج خود وہی بن جاتا ہے اور اُس کے ذریعے حکومت اور رائے عام دونوں کے سامنے حق واضح ہوتا ہے اور باطل کی تردید ہوتی ہے!



سوال صرف احتجاج تک محدود نہیں ہے، بلکہ دین کے بہت سے رمز شناسوں کو اصل اختلاف احتجاجی مظاہروں سے ہے۔ مظاہرہ ان حضرات کے لئے ایک غیر دینی سی کارروائی ہے یا دنیوی سیاست کا ایک طریقہ کار ہے۔ یہ احساس بھی درحقیقت اسی بنیادی تصورِ دین و سیاست کے بگاڑ کا نتیجہ قابلِ غور ہے کہ مظاہرے کی اصل حقیقت کیا ہے؟

ایک ہوتا ہے فرد کا احتجاج کسی فرد کے ظلم کے مقابلے میں، دوسری طرف ایک جماعت کا احتجاج ہوتا ہے کسی نظامِ اجتماعی کی زیادتیوں کے خلاف، اور ان دونوں کی حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ظالم فرد کے ظلم کا دائرہ محدود ہوتا ہے لیکن ظالم نظام کے ظلم کے اثرات دور رس ہوتے ہیں، چنانچہ ایک مظلوم فرد کی مظلومیت کے مقابلے میں ایک جماعت اور ایک قوم کی مظلومیت بہت بڑے درجے کی ہوتی ہے۔ آخر الذکر کی لپیٹ میں ہزاروں افراد بلکہ پورے ملک کا مظلوم ہوتا ہے

اس فرق کے پیش نظر ایک فرد کے محدود احتجاج کے مقابلے میں ایک جماعت کو وسیع تر احتجاج کرنا پڑتا ہے وہ ظلم کی ممانعت کیلئے ایک قوم کی قوم کے جذبات مہمردی کو اول کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ چنانچہ فرد کا احتجاج اگر دو چار تلخ جملے کہہ دینے سے پورا ہو جاتا ہے تو ایک جماعت کو اسی مقصد کیلئے سینکڑوں تقریریں نشر کرنی پڑتی ہیں، فرد ایک خط یا دستخط لکھ کر یا اخبار میں ایک مراسلہ شائع کر لے کہ جس مقصد کو حاصل کر لیتا ہے، ایک جماعت اس کو حاصل کرنے کیلئے سینکڑوں لوگوں کو غمخیزانہ مہمیں، بینڈ بولوں اور کتبائے (Placards) کو استعمال کرنے پر مجبور ہوتی ہے، فرد کے لئے دو چار آدمیوں سے مل کر جذبات کا اظہار کر دینا قیصر خیز ہو سکتا ہے، لیکن جماعت کو پوری کی پوری قوم کے سامنے اپنے جذبات کی ممانعت کرنی پڑتی ہے، فرد کی مناکر میت کا مظاہرہ کرنے کیلئے اس کا چہرہ بتنا کام دے جاتا ہے، جماعت کو اتنے کام کیلئے ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک ایک منظم طاقت کو برسرِ عام لانا پڑتا ہے۔ پس اجتماعی نظام کے مظالم کے خلاف جماعتوں کے مظاہرہ کی نوعیت ایک خاص طرح کی ہے اور ان کا پیمانہ بہت وسیع ہوتا ہے۔

قدیم زمانے میں جبکہ حکومتیں شخصی ہوتی تھیں اور ان پر تنقید کرنے یا ان کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھانے یا ان سے کوئی مطالبہ کرنے کیلئے یہ کافی ہوتا تھا کہ آپ کسی طرح دربارِ سلطانی میں پیش ہوئے اور اپنی بات پہنچا دی لیکن آج کل کی حکومتوں کا دربار کسی چار دیواری کے اندر محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ملکوں کی اصل حکمران طاقت راتے عام ہوتی ہے اور وزراء اور پارلیمنٹ کے ممبران کے نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ نمائندے کسی مطالبے، کسی شکایت، کسی احتجاج اور کسی تنقید پر صرف اسی صورت میں توجہ دیتے ہیں جبکہ انہیں محسوس ہو جائے کہ راتے عام کا دباؤ اس کی پشت پر موجود ہے یہی بات عوام کے نمائندوں پر واضح کرنے کیلئے کہ کسی آواز کی پشت پر راتے عام کی طاقت موجود ہے، مظاہرات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ دورِ حاضر کی حکومتوں کے عوامی طرز پر نشوونما پانے کے ساتھ راتے عام کے مظاہرات ایک طبعی ضرورت کے طور پر ارتقاء پذیر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور آج ان سے صحیح طور پر کام لے بغیر کوئی متحرک پوری طرح کام نہیں کر سکتی۔

اگر مظاہرات کا تجزیہ کہ کے دیکھا جائے تو اس کی ماہیت صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک منظم طاقت نظامِ تمدن و سیاست کے خداوند اور ملک کے عوام کو اپنے احساسات آگاہ کرتی ہے وہ یہ بتاتی ہے کہ اس کی نگاہ میں فلاں فلاں کارروائی مضر غلط اور ظالمانہ ہے اور اس کی ڈک تھام کی جانی چاہیے، بخلاف اس کے فلاں چیز کرنے کی ہے اور اسے عمل میں لانے کا ہتھام ہونا چاہیے، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مظاہرہ خود بیکر ایک دعوت اور ایک تبلیغ ہی ہوتا ہے وہ دعوت و تبلیغ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، مظاہرہ غلط کو غلط اور صحیح کو

صحیح کہنے کی ایک عملی اور اجتماعی صورت کا نام ہے وہ منکر کو منکر اور معروف کو معروف کہنے کا ایک وسیع الاثر پیرا ہے۔ مظاہرہ صرف حکمران طاقت ہی کو خطاب نہیں کرتا بلکہ وہ رائے عام کی تربیت کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ مظاہرہ عوام ملک کے سامنے ایک مسئلے کو پوری طرح اجھار کر اور وقت کا اہم ترین سوال بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جو اسے جانتا ہو وہ بھی اُس پر سوچنے لگے اور جو اسے نہ جانتا ہو وہ بھی جانے اور سوچنے پر مجبور ہو جائے، لوگوں میں اس مسئلے پر عام گفتگوؤں کا سلسلہ چھڑ جائے، دو طرفہ دلائل کا چرچا ہونے لگے، اور آہستہ آہستہ عوامی طاقت ایک حق کی حمایت اور اس کے برعکس باطل کی مہرمت کے لئے یکسو ہو جائے۔

یہی مقصد تھا جس کے تحت حضرت امام مالکؒ نے مین اُس وقت جبکہ ان کو اونٹ پر سوار کر کے اور ان کے چہرے پر سیاہی لپیپ کر مینے کی گلیوں میں گھسیا جا رہا تھا تو اس وقت باواز بلند عوام سے قدم قدم پر یوں خطاب کیا کہ جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ بھی جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں اور میں کہتا ہوں کہ جو واکراہ سے دلوائی ہوئی طلاق عندائہ نافذ العمل نہیں ہوتی۔ آپ یہ کلمات کہتے ہوئے ہمہ تن ایک مظاہرہ تھے، منصور کے غلط نقطہ نظر اور اس کے ظالمانہ طرز عمل کے خلاف، اور اس طرح آپ رائے عام کو درحقیقت دین کی دعوت پہنچا رہے تھے۔

خدیجی صلعم نے جب ایک مرحلے پر آکر پوری طرح محسوس کر لیا کہ اہل کتاب ہمہ تن فتنہ ہیں اور روشن سے روشن دلائل بھی ان کے ضمیروں کو نہیں چوتکا سکتے تو آپ نے آخری حربے کے طور پر ان کو مباہلہ کی دعوت دی اور خود اہل بیت سیدان میں آکر خمیر زن ہو گئے۔ مباہلے کے طریق کار میں مظاہرے کا ایک پہلو بہر حال موجود تھا اور فریقین کا اختلاف آپ کے میدان میں آکر خمیر زن ہو جانے سے پوری پبلک کے سامنے اہم ترین مسئلے کی حیثیت سے آگیا اور اہل کتاب کے فرار نے ان کی اخلاقی کمزوریوں کو اور آنحضرت صلعم کی قوت یقین کو ماری دنیا کے سامنے واضح کر دیا۔ دلائل سے دعوت دیتے دیتے جب نبی صلعم نے مباہلہ کی یہ صورت اختیار کی ہوگی تو بظاہر یہ ایک اونٹنی چیز محسوس ہوئی ہوگی لیکن درحقیقت یہ بھی دعوت نبی کی ایک شکل تھی جس کا روئے سخن اہل کتاب کے ساتھ ساتھ پوری رائے عام کی طرف تھا اور یہ ایک ایسا خطاب تھا جس نے ماحول کے ایک ایک کونے تک حق کی آواز پھیلا دی۔

پس مظاہرہ اگر جائزہ مدد میں رہے تو اپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے دعوت کا ایک وسیع الاثر ذریعہ ہوتا ہے۔

— اور فی نفسہ اس میں دینداری کی کوئی نئی نہیں پائی جاتی، الایہ کہ اس کے لئے پیرایہ اور طریق کار غلط اختیار کیا جائے۔

ایک خدشہ یہ محسوس کر لیا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کے سیاسی طور طریقوں کو اختیار کر لینے سے تعمیر سیرت و تقویٰ کا پروگرام کمزور ہو جائیگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اب تک جو سرمایہ اخلاق و کردار جمع کیا جا چکا ہے وہ بھی نقصان کا شکار ہو جائے۔ پس اگر ان سرگرمیوں کو اختیار کرنا ہی تھا تو ابھی کافی مدت تک سیاسی مصروفیات سے بچ کر داخلی تعمیر کا کام مکمل کر لینا چاہئے تھا۔ اس خدشہ کو سب سے پہلے خود جماعت اسلامی اور اس کے قائم کرنے والوں ہی نے پوری اہمیت کے ساتھ محسوس کیا تھا اور اسی کے پیش نظر جماعت نے سات سال تک جلسوں اور مظاہروں سے اپنا دامن بچا کر پہلے وہ نئی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ان فضائل سیاسی کو پرانی روایات سے پاک کر کے نئے انداز میں سر انجام دینے کے قابل ہو۔

جماعت اسلامی اپنے حلقہ اثر میں یہ گہرا احساس پہلے سے بردا کر چکی ہے کہ میاست کے خارجی اور فائشی ہنگاموں کو اصل تحریک بنالیت اور ذہن دیرت کی تعمیر کے لئے کوئی ٹھوس اہتمام نہ کرنا کبھی بھی ایک اسلامی تحریک چلانے اور اس کے نتیجے میں اسلامی نظام قائم کر دکھانے میں کارگر نہیں ہو سکتا۔ ایک جماعت کی اصل قوت کار سیاسی مظاہر نہیں، بلکہ اس کی حکم فکر اور اس کے کارکنوں کی ٹھوس سیرت ہوتی ہے۔ سیاسی مظاہر صرف ذرائع و وسائل ہیں جن کو وقتی ضروریات کا لالچا کرتے ہوئے اختیار کرنا پڑتا ہے۔

جماعت اسلامی کے وجود میں آنے سے قبل تحریک مجاہدین سرحد کے بعد کوئی ایسا نظام جماعت موجود نہیں تھا جو اسلام کے خطوط پر اٹھارو کھارو کے ارتقاء دینے کے لئے کوئی ٹھوس طریق اختیار کرتا، بلکہ اس دوران میں ہماری ساری سیاست محض خارجی مظاہر کے بل پر چلتی رہی ہے اور خارجی مظاہر سے جذبات میں تو حرکت آتی رہی ہے لیکن شہد کی تربیت اور اخلاق کی تعمیر کا کوئی سامان نہیں ہو سکا، بلکہ انہی سیاست کے جذباتی مظاہر نے مسلمانوں کے اجتماعی سیاسی کردار کو اور زیادہ خانہ خراب کر دیا ہے۔ چنانچہ جماعت نے ایک مدت تک ان جذباتی مظاہر کے فی نفسہ جواز ہرنے کے باوجود ان سے اپنے کارکنوں کو پرہیز کر لیا ہے، تاکہ کہیں فائش پسندی اور کھوکھلی ہنگامہ آرائی کی پرانی عادات میں پھر جان نہ پڑ جائے لیکن جب یہ اس پہلو سے اطمینان ہو گیا تو آہستہ آہستہ تندہی سیاسی حرکت کے لئے مختلف ذرائع و وسائل کو باندہ از نو استعمال کیا جانے لگا۔

علاوہ بریں سیاست کے خارجی مظاہر ایک عرصہ دراز سے اسلام کی حدود سے آزاد چلے آ رہے تھے جنہیں جلوس میں بلڑا دی، تقریروں میں جذباتی اشتعال انگیزی، جلوسوں میں فتنہ گردی، نعروں میں دشنام طرازی اور پروپا

میں جھوٹا پروپیگنڈہ، ہینڈ بول میں فتنہ انگیزی، مظاہرات میں بے وقری، ہر تالوں میں جبر و تشدد، ہماری سیاست کا لازماً بننے چلے آرہے تھے۔ چنانچہ جماعت نے اس بے اسلام سیاسی ہنگامہ آرائی کے ناپاک مظاہر کے خلاف ایک شدید نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ نفرت ماضی کے ردِ عمل کے طور پر بعض اصحاب میں حدِ ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گئی ہے اور وہ مظاہر سیاست کو اسلامی حدود کی پابندی میں محدود ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح کردہ اور مضر سمجھتے ہیں جس طرح وہ اس سے پہلے تھے۔

ہم نے عند الضرورت ایک حکیمانہ تدبیر کے ساتھ ان تمام ذرائع و وسائل سے کام لینا شروع کر دیا ہے جن کے بغیر کوئی تحریک عوامی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی، لیکن ان سب کو پرانی ناپاک روایات سے پاک کر کے اسلامی اصولوں کے خداداد پر گھما کر از سر نو ان کی نوک پلک بنانی ہے اور مظاہر سیاسی کی نوعیت کو بدل دیا ہے۔ ٹھوس علمی لٹریچر کے ساتھ ہم اب پوسٹروں اور ہینڈ بولوں سے بھی کام لیتے ہیں، اپنے مخصوص اجتماعات کے ساتھ ساتھ ہم اب جلسے لائے عام بھی کرتے ہیں، اصولِ دین کی دعوت کے ساتھ ہم حکومت کی اصلاح کے لئے مطالبے اور ریزولوشن بھی سامنے لاتے ہیں، اور زبانِ قلم سے اظہارِ جذبات کے پیلو بہ پیلو مظاہرات سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور آگے چل کے ہمیں دوسرے مختلف جائز طریقے بھی ذرائع و وسائل کی حیثیت سے اختیار کرنے ہوں گے۔

لیکن ہم نے سیاست کے ذرائع و وسائل کو اسلامی حدود کا پابند بنا کر اتنا بدل دیا ہے، کہ ہمارے پوسٹر ہمارے جلسے، ہمارے بیانات، ہمارے ریزولوشن، ہمارے مطالبے اور ہمارے مظاہرے خود تعمیرِ فکر و سیرت کے نہایت موثر ذرائع بن گئے ہیں۔ وہ سیاست جو فحش و منہوی خطوط پر چلتی رہی ہے، اس کے مظاہر یقیناً سیرت و اخلاق کے لئے تباہ کن تھے، لیکن اب جبکہ سیاست کو دین کی شاہراہ پر ڈال دیا گیا ہے، اب یہ مظاہر خود تعمیرِ سیرت و اخلاق کے بہترین ذرائع ثابت ہو رہے ہیں۔ ہماری تمام سیاسی سرگرمیاں جماعت کے کارکنوں کے لئے بھی اور عوامِ اناس کے لئے بھی سنبیدگی، وقار، پابندیِ وقت، احترامِ نظم اور اہتمامِ اخلاق کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا ایک قابلِ قدر سامان بنتی جا رہی ہیں۔ اللہ کی اس عنایت پر ہم اس کے مدد پر شکر گزار ہیں۔

سلطہ جماعت اسلامی کے جلسوں کی مخصوص ذمیت سے پورا ملک پہلے ہی متاثر تھا۔ لیکن مجد اللہ کی جماعت کے فاعلش اجتماعی مظاہر نے ہر مقام پر پہلے سے بھی زیادہ اچھا اثر ڈالا ہے۔ اور عام شہریوں کے علاوہ بعض سرکاری افسر اور پریس کے (باقی اگلے صفحہ پر)

وہ دنیا پرستانہ سیاست جس سے کتارہ کش ہوتے بغیر سیرت و تقویٰ کی تعمیر ممکن نہیں اس کے ناپاک مظاہر سے جیسی نفرت ہمیں کل تھی ویسی ہی آج بھی ہے، لیکن سیاست کے اسلامی حدود میں پابند ہو جانے کے بعد بھی جو لگ اس کے معتدل اور متوازن مظاہر کو تقویٰ کے منافی اور سیرت کے لئے مہلک سمجھتے ہوں، ان کے دل و دماغ میں یقیناً دین و سیاست کی تفریق کا نظریہ اب تک پناہ گزین ہے۔ حالانکہ وہ سیاست جس کا محور نظام اسلامی کے قیام کا نصب العین ہو اور جس کے طریقہ کار کا سر پہلو اسلامی حدود و اخلاق کا پابند ہو، وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ اور تمام نفل عبادات سے افضل عبادت ہے۔ یہ افضل ترین عبادت صرف ایسے لوگوں نے تقویٰ کے لئے تباہ کن ہوتی ہے جو سیاست کی ذمہ داریوں کو دین سے الگ سمجھتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے نزدیک سیاست کی ساری خدمات خود دین ہیں، وہ تو نظام اسلامی کے قیام کی جدوجہد میں جو قدم بھی اٹھاتے ہیں وہی ان کے لئے تعمیر تقویٰ کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ جماعت کے اکثر کارکنوں کا حال یہی ہے کہ وہ جب تا نگے پر بیٹھے کوئی اعلان کر رہے ہوتے ہیں، کسی ہیڈ بل کو تقسیم کرتے ہیں، کسی جلسے کے لئے دیاں بچھا رہے ہوتے ہیں، دیواروں پر کوئی پوسٹر چسپاں کر رہے ہوتے ہیں، کسی اجتماع میں شرکت کے لئے مصروف سفر ہوتے ہیں، اور اسی طرح جب وہ کسی مظاہرے میں کتبات لئے چلا ہے پر کھڑے ہوتے ہیں تو وہ ان ساری ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے آقا کی اطاعت و عبادت کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیفیت صرف ان قلوب کے لئے حرام کر دی جاتی ہے۔ جو اسلامی سیاست کو بھی دین سے الگ کوئی چیز شمار کرتے ہیں۔

پھر یہ امر بجاٹے خود قابل غور ہے کہ زندگی کی جنگاہ سے الگ بیٹھ کر تعمیر سیرت کرنے کے لئے میدان کار ہے کہاں؟ جسے پیراک بنا ہو، اسے بہر حال پانی کی موجوں کے اندر ہی پیرنا سیکھنا ہوگا۔ پانی سے باہر پرنے کی کوئی تربیت گاہ اس آسمان کے نیچے کہیں موجود نہیں ہے۔ اخلاق و تقویٰ پیدا کرنے کے لئے روحانی کسرت کا کوئی مقبرہ کو رس نہیں ہے کہ ہنگامہ لئے حیات سے الگ رہ کر پہلے اسے پورا کر لیا جائے اور پھر سند فراغت ملنے کے بعد اپنے آپ کو مختلف ذمہ داریوں میں مصروف کیا جائے۔ اخلاق و تقویٰ

دینیہ حاشیہ میلان صفحہ ۱۷۱ کا ذکر بھی اس سے خاص طور پر متذہب ہے۔ راتاً جماعت کی طرف مسلسل حوصلہ افزا رپورٹیں موصول ہوتی ہیں۔

تو زندگی میں کرنے ہی سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی حد تک پیدا ہوتا ہے جس حد تک عملی سرگرمیوں میں حصہ لیا جا رہا ہو۔ خلوت میں رہتے تو خلوت ہی کا تقویٰ پیدا ہوگا، جلوت کا تقویٰ خلوت میں نہیں آسکتا اس کے لئے تو جلوت میں ہی آنا پڑیگا۔ کاروبار کا تقویٰ صرف کاروبار کرنے کے دوران میں پیدا کیا جاسکتا ہے، مسجد میں نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ میدان جنگ کا تقویٰ تیغ و تھنگ کے ہنگامے میں کود پڑنے والوں ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ سبکداری راجل کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ بالکل اسی طرح سیاسیات کا تقویٰ جو عام انفرادی سرگرمیوں کے تقویٰ سے بہت ہی بلند مرتبہ ہے — سیاسیات سے واسن بچا کر پیدا کرنا ناممکن ہے، اسے جب بھی آپ پیدا کرنا چاہیں گے تو آپ کو لازماً میدان سیاست میں قدم رکھنا ہوگا۔ رضائے الہی کو اپنا مقصود بنا کر آپ حدود اللہ کی پابندی کرتے ہوئے جس سرگرمی میں بھی حصہ لیں گے وہ عین عبادت بن جائے گی اور آپ کے اندر اخلاق و تقویٰ کی تعمیر کا وسیلہ ثابت ہوگی، لیکن اگر یہ نہ ہو تو پھر آپ کو خود اپنی ہر حرکت پر محسوس ہوگا کہ یہ تو "ذنیوت" ہے اور یہ تو ذہن و سیرت کے لئے تباہ کن ہے۔ اور اس طرح آپ آخراً مجبور ہو جائیں گے کہ کسی خانقاہ میں جاگے پناہ لیں، اور پھر ٹپسے رہیں "تقصود جانناں لئے ہوئے" بلاشبہ آپ کو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے جو کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ان میں دینلئے تصوف کا یہ "تقصود جانناں" آپ کو نہیں ملے گا، بلکہ آپ جب بھی ادھر بڑھیں گے تو وہ فسطح قسم کا تصوف جانناں کہیں فضا میں کھو جائے گا اور آپ اس کے پیچھے ماتہ پھیلائے ٹامک ٹوٹے مارتے پھریں گے، لیکن اس کا سرائے نہ ملے گا۔ بخلاف اس عالم خواب کے سے تصوف جانناں کے ہماری سرگرمیوں میں آپ کو عالم بیداری کا ایک نیا تصوف جانناں محسوس ہوگا، بشرطیکہ آپ دین و سیاست کی تفریق کے "حجاب اکبر" کو چاک کر کے آگے بڑھیں۔

یہ بلاشبہ درست ہے کہ ایک جماعت کو عوامی دور سے قبل ایک دور ابتدائی تیاری اور تعارف کا عبور کرنا پڑتا ہے جس میں وہ سیاست میں براہ راست مداخلت کرنے کے بجائے بالواسطہ طور پر اثر ڈالتی ہے اور عملی انقلاب کے لئے زمین ہموار کرنے کی خاطر سے ایک فکری انقلاب برپا کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ لیکن یہ سوال کہ اسے کب تک فکری انقلاب ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہئے اور عوامی دور میں قدم

(بقیہ برصغیر)

رکھنے سے کتنی مدت اجتناب کرنا چاہئے، اس سوال کا انحصار جتنا اس کے داخلی حالات پر ہوتا ہے اس سے ہمیں زیادہ خارجی تقاضوں پر بھی ہوتا ہے۔ پھر داخلی اور خارجی تقاضوں میں توازن کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرتی ہے۔

جماعت اسلامی ابتدائی تیاری کے دور کو لبا کرنا چاہتی تھی لیکن حالات نے اس کا ماتہ پکڑ کے اسے میدانِ کار میں طلب کر لیا ہے۔ ہمارے ماحول میں اسلامی اور غیر اسلامی فکر کے درمیان جو آدیزش دیکھی دیکھی چلی آرہی تھی، وہ تقسیمِ ہند سے قبل ہی خاصی تیز ہو چکی تھی لیکن آزادی اور تقسیم کے بعد وہ معاً انتہائی اشتعال پر پہنچ گئی۔ اب جبکہ حالات بتا رہے تھے کہ اس کشمکش کا فیصلہ اور صریحاً اور بہت جلد ہو جانے والا ہے اور آزادی کے بعد ابتدائی ۵ سال (یا زیادہ سے زیادہ ۱۰ سال) اسلام کے لئے بالکل فیصلہ کن ہیں تو جماعت اسلامی کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ ہمد تن "عشق" بنے اور "بے خطر آتشِ نرود" میں کود جائے۔ اس موقع پر عقل کو محو متا شائے لبِ بام چھوڑنے کے علاوہ کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں۔ تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک اتھمائی اہم موڑ مٹرنے والی ہے اور اگر اسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کے لئے فوراً ہی ایک منظم قوت اس کے آڑے نہ آئے تو پھر یہ دریا الحاد (Secularism) کے رخ بہ جانے کے بعد جب کنارے کاٹتا ہوا اپنی رو دکاہ کو گہرا اور اپنے پاٹ کو چوڑا کر چکے گا تو پھر اسے ایک نئی سمت میں موڑنا دنیا کا ایک حال کام ہوگا۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے اپنے ماحول، اپنی حریف طاقتوں، اپنے دور کی تاریخ، اور اپنے وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے، زمین جنبدہ جنبد گل محمد "کاڈمنگ اختیار نہیں کیا کہ چاہے تمدن و سیاست کی ساری بازی شاطر الحاد جیت جاتے لیکن وہ ایک گوشے میں بیٹھے تعمیرِ سیرت کے کام میں لگے رہیں۔ جب اسلام دشمن طاقتیں زندگی کے حرم کے دروازے توڑ کر اس پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لئے آخری ہتھ بول رہی ہوں تو ان لوگوں کی سیرتیں اور تقویٰ کس کام کا جو اپنی جانوں کو بچانے کے لئے گمہ دیں کے دروازے بند کئے بیٹھے رہیں۔ جماعت اسلامی نے جس سوزِ مطالبہ نظامِ اسلامی کی تحریک شروع کر کے حوائی دور میں قدم رکھا ہے، حالات گواہ ہیں کہ یہ کام اس روز سے سو فرکانا مہلک ہوتا

وقت کی پکار کو اگر ہم لوگ اس کان سن کر اس کان اڑا دیتے تو آج "قرار دادِ مقاصد" میں جو ہر اسلامیت کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا بلکہ یہ کھلم کھلا دینی ریاست کی تعمیر کا ایک اسلام کش اعلان ہوتی اور آج ہماری حکومت کی گاڑی غیر اسلامی راستے پر نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہوتی۔

پس اب جبکہ ایک قدم اٹھ چکا ہے، اس کے واپس لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اب اسے آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ اب اس کا رکن یا پیچھے ہٹنا۔۔۔۔۔ چاہے وہ تعمیر سیرت ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔۔۔۔۔ ایک معرکہ کشمکش سے فرار کی حیثیت رکھتا ہے، اور قرار ایک انقلابی تحریک کے لئے ہمیشہ سوت ثابت ہوتا ہے۔ اس فرار کے بعد ایک جماعت محض مذہبی فرقہ یا سیاسی جھنڈے کے رہ جاتی ہے، وہ زمانے کی لامست نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک یہ ناگزیر ہے کہ تعمیر سیرت کے لئے جو کچھ بھی اہتمام کیا جائے وہ اس کشمکش کو جاری رکھتے ہوئے کیا جائے جو ایک فرض بن کر ہمارے اوپر لازم ہو چکی ہے۔

اب یہ ممکن نہیں ہے کہ عوامی دعوے میں قدم رکھنے کے بعد ہم لوگ ان فزائے دوسائل سے کام نہ لیں جو سیاست کے عوامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے جب شکستہ میں کراچی کی تقریر کے بعد یہ سوال کیا گیا کہ آپ مطالبے کو منوانے کے لئے کن طریقوں سے کام لیں گے تو موصوف نے صفائی سے یہ جواب دیا تھا کہ ہمیں اس کے لئے وہ سارے فزائے اختیار کرنے ہوں گے جو آپ نے مطالبہ پاکستان کے لئے اختیار کئے تھے۔ (ان کے خلاف اسام پہلوؤں کا استیضہ بہر حال اپنی جگہ پر مسلم ہے)



ادب کی گذرشات کا فضا صرف یہ ہے کہ اسلام کے ایک تحریک کی صورت میں ارتقاء کرتے ہوئے طبی طور پر جو مراحل اسے پیش آکر ہے ہیں اور آئے داتے ہیں، ان کو ہمارے معتز ضمیم اور ہمارے خیر خواہ دونوں جامعہ مذہبیت اور دین و سیاست کی تعزیر کی مینگوں سے نہ دیکھیں، اور قدم قدم پر اپنا چھوڑ دیں۔

دماغوں کو ناب کرنا بیٹھے، نگاہوں کو دور رسھی کا دوس ویٹھے، سینوں کو خزانہ دیکھنے اور حوصلوں

کو عالی ظرفی کی صفت سے آراستہ کیجئے، یہاں تک کہ آپ پیش آمدہ مراحل کے تقاضوں ہی کو نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بتدریج پیش آنے والے احوال و مقامات کی ذمہ داریوں کو قبل از وقت سمجھ سکیں۔ آپ کو اپنے ملکی ماحول ہی کو نہیں، جہانی ماحول کو تفصیل سے سمجھنا چاہئے۔ آپ کی تاریخ کی سمت ارتقاء اور وقت کے بہاؤ کی رفتار کو جانتا چاہیے۔ آپ کو اسلام کی وسعتوں پر نگاہ رکھنی چاہئے، اس کے بغیر اسلام کی انقلابی تحریک کے ہر نئے مرحلے میں داخلے کے وقت آپ کو خواہ مخواہ کی الجھن ہوگی۔

خود ہمارے لئے یہ صورتِ حالات بہت ہی مضرتناج رکھتی ہے کہ ہم اپنی ساری قوت صرف کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں، اور ہمارے معترضین سامنے سے آکر ہمارے لئے رکاوٹ بنیں اور ہمارے غیر خواہ چھپے سے بڑھ کر ہمیں کھینچ رہے ہوں۔

معترضین سے تو ہم زیادہ توقعات وابستہ نہیں کر سکتے، البتہ اپنے غیر خواہوں سے ضرور یہ امید کرتے ہیں کہ منگدہ بالا تصریحات پر وہ خاص طور پر غور و فکر کر کے جماعت کی راہِ عمل کا ایک صحیح اندازہ قائم کریں گے۔ کہ وہ کدھر سے ہو کر کدھر کہ جاتی ہے۔ یہ حقیقت اگر ایک مرتبہ ذہن نشین ہو جائے تو پھر انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا کہ قدم قدم پر آپ اپنے اندر ایک ذہنی انتشار محسوس کریں اور ہر مرحلے پر ارشاد فرمائیں۔ کہ

”لقد جئت شیئاً اِمْلاً“ (سورہ کہف)